© rasailojaraid.com



# تبصرے

## Quranic Exegesis and Classical Tafasir

## قرآن کی تفاسیر کا کلاسیکی دور

جنوری ۱۹۷۰ء کے المعارف میں ڈاکٹر رشید احمد صاحب کی کتاب "Abu Al Qasim Al-Qushairi as a Theologian and Commentator" "ابوالقاسم القشیری بحیثیت ایک عالم دین اور مفسر قرآن" پر تبصرہ کیا گیا تھا۔ زیر نظر کتاب اس بحث کا ایک حصہ ہے۔ اس کتاب کو ڈاکٹر صاحب موصوف کی پہلی کتاب کا مقدمہ یا تمہید سمجھنا چاہیے۔

مصر کے مشہور محقق و صاحب تصانیف ڈاکٹر احمد امین نے لکھا ہے کہ اسلامی تاریخ کے ہر دور میں قرآن مجید کی جو بھی تفسیریں لکھی گئیں، ان میں اکثر و بیشتر اس دور میں مسلمانوں کے ہاں جو افکار و معتقدات مروج تھے، ان کا ذکر ہے، اور ان کی تردید یا تائید میں بحثیں کی گئی ہیں۔ چنانچہ اگر ہم اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار کی علمی و فکری تاریخ مرتب کرنا چاہیں تو ان ادوار میں لکھی گئی قرآن مجید کی تفسیروں سے ہمیں بڑی مدد ملے گی۔

بات دراصل یہ ہے کہ مسلمان اہل علم نے ہر دور میں قرآن مجید کو اس دور کے علمی و فکری پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اور گذشتہ صدیوں میں علم التفسیر کا جس طرح ارتقا ہوا، اس میں ایک بہت اہم عامل یہ بھی تھا۔ ڈاکٹر رشید احمد نے القشیری کا بحیثیت ایک مفسر کے مقام معین کرنے کے لیے ان کے عہد تک علم التفسیر ارتقا کے جو مراحل طے کر چکا تھا، اس کتاب میں ان کا احصا و محاکمہ کیا ہے۔ کیونکہ القشیری نے جو تفسیر لکھی، نا ممکن تھا کہ وہ تفسیر نویسی کے اس عام معمول سے متاثر نہ ہوتے اور وہ قرآن مجید کی تشریح و تعبیر اپنے زمانے کی زبان نیز اپنی فکری افتاد کے مطابق نہ کرتے۔

ڈاکٹر صاحب نے ابتدائے کتاب میں اس امر کی شکایت کی ہے کہ مختلف زمانوں میں قرآن کی جو تفسیریں لکھی گئیں، ان میں سے اکثر اس میں اور اس سے استفادہ کرنے والوں کے درمیان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ایک رومک سی بن کر رہ گئیں۔ بے شک یہ بات تو صحیح ہے لیکن ہمارے خیال میں تفسیریں لکھنے والوں کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ یہ اس لیے کہ ان تمام زمانوں میں مسلمانوں کے لیے زندگی کے ہر معاملے میں ہدایت و رہنمائی کی آخری و قطعی سند قرآن تھا۔ اور جب اس مقصد کے حصول کے لیے اہل علم قرآن کی طرف رجوع کرتے تھے تو لامحالہ ان کو اپنے زمانے کے مسائل کا ذکر کر کے ان کے حل، اس سے تلاش کرنا پڑتے تھے۔ اسی لیے قرآن کی تفسیریں اس نہج پر لکھی گئیں۔ اور اس طرح ہر دور کے مفسرین نے قرآن سے اپنے دور کے مسائل کے حل ڈھونڈے۔ اور یوں ان تفسیروں میں ہر دور کے افکار و اعتقادات کا بہ تفصیل ذکر آیا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اچھا نہیں ہوا۔ لیکن یہ ہوا ضرور اور اس کا ہونا از مقتضیات زمانہ تھا۔ چنانچہ ہمارے قریبی دور تک میں شیخ محمد عبدہٗ اور ان کے شاگرد سید رشید رضا اور سر سید احمد خاں کی تفسیریں اسی نہج پر لکھی گئیں۔ اور آج کی تفسیروں میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے۔

مصنف لکھتے ہیں کہ تفسیر القرآن کے ضمن میں شروع ہی میں دو مکتبِ خیال پیدا ہو گئے۔ ایک تفسیر بالروایت اور دوسرا تفسیر بالرائے کا۔ تفسیر بالروایت کے سلسلے میں عیسائی اور یہودی روایات جنھیں اسرائیلیات کا نام دیا گیا ہے۔ تفسیر القرآن میں داخل ہو گئیں۔ اور تفسیر بالرائے کے تحت وہ افکار و معتقدات جو یونانی و ایرانی علوم کے تحت مسلمانوں میں پیدا ہو گئے تھے، ان کی بحثیں تفسیر کا حصہ بن گئیں۔ اس معاملے میں ڈاکٹر صاحب نے بالکل ٹھیک لکھا ہے۔ "قرآن کی روح کو بے نقاب کرنے کے لیے قرآن کے طالب علموں کو اس کے چہرے سے ان سب پردوں کو ہٹانا چاہیے اور ان ساجی اور مذہبی احوال و کوائف کا مطالعہ کرنا چاہیے، جن میں قرآن کا نزول ہوا۔" مصنف کہتے ہیں: "عہد گزشتہ میں اور اس دور میں بھی بعض علما اس مکتبِ خیال کے حامی رہے ہیں۔" یہاں ضمناً موصوف نے یہ بحث بھی کی ہے کہ آیا قرآن کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنا جائز ہے یا نہیں۔ ایک عرصے تک عربوں اور ترکوں میں قرآن کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنا ممنوع سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس کے خلاف مصنف نے ترجمہ کے جواز میں متقدمین کے اقوال نقل کیے ہیں۔

مصنف کے نزدیک تفسیر کے مآخذ میں سے سب سے پہلا ماخذ تو خود قرآن ہے کیونکہ جیسا کہ مروی ہے، قرآن کے بعض حصے اس کے دوسرے حصوں کی تفسیر کرتے ہیں۔ اس کے بعد قرآن کی تشریح و تعبیر کے سلسلے میں رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مروی روایات ہیں۔ اس میں شک نہیں،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



جیسا کہ امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ تفسیر کے بارے میں اگر رسول اللہ صلعم کی کوئی صحیح حدیث ہم تک پہنچتی ہے تو ہمیں اسے قرآن کی تفسیر کے طور پر لازماً تسلیم کر لینا چاہیے۔ لیکن وہ اور امام زرکشی اس ضمن میں یہ تصریح بھی کرتے ہیں کہ تفسیر کے متعلق جو روایات بالعموم بیان کی جاتی ہیں، ان میں سے اکثر موضوع ہیں۔ اور جو صحیح ہیں، وہ بہت کم ہیں۔ اسی سلسلے میں امام احمد بن حنبل کا یہ قول بھی مشہور ہے کہ تفسیر القرآن کی روایات کی کوئی بنیاد نہیں۔

تفسیر بالروایت میں سب سے اہم واسطہ حضرت ابن عباس ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کی حقیقی اور روایتی شخصیت کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ ان سے جو اصحاب تفسیر کی روایت کرتے ہیں، وہ زیادہ تر غیر ثقہ ہیں۔ نیز حضرت ابن عباس چونکہ خلفائے عباسی کے مورث اعلیٰ تھے، اس لیے بعد والوں نے ان سے ہر طرح کی روایات منسوب کر دیں، جس کی وجہ سے تفسیر القرآن کے ضمن میں اسرائیلیات کا ایک طومار جمع ہو گیا۔ مصنف کی اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ تفسیر القرآن میں جو احادیث نبوی، آثار صحابہ اور اقوال تابعین و تبع تابعین روایت کیے گئے ہیں، ان کے تمام تر صحیح ہونے پر شروع سے شک کیا جاتا رہا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے امام راغب کی یہ رائے بیان کی ہے: "جو تفسیر میں صرف روایات پر انحصار کرتے ہیں، وہ یقیناً تفسیر کے ایک بڑے حصے کو چھوڑ دیتے ہیں۔"

تفسیر بالرائے کے باب کے تحت مصنف لکھتے ہیں کہ جہاں تفسیر بالروایت کے قائل قرآن کی تفسیر میں "رائے" یا عقل سے کام لینے کے بالکل خلاف ہیں، وہاں تفسیر بالرائے کے حامی تفسیری روایات کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ خود امام غزالی نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے تفسیری روایات کی تضعیف کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "اگر تفسیر بالروایت کے حامی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تفسیر کی بنیاد روایات ہونی چاہئیں نہ کہ "استنباط" اور شخصی "رائے" تو اس صورت میں انھیں تفسیر کے معاملے میں ابن عباس اور ابن مسعود کے اقوال قبول نہیں کرنے چاہئیں، کیونکہ یہ اقوال براہ راست رسول اللہ صلعم سے ماخوذ نہیں۔" بہر حال امام غزالی نے تفسیر القرآن میں "رائے" اور عقل کے استعمال پر بہت زور دیا ہے، اور لکھا ہے کہ محض تفسیر بالروایت کو کوئی بڑا علمی کارنامہ نہیں سمجھنا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب نے تفسیر بالرائے کے معاملے میں معتزلہ کے کردار پر خاص طور سے روشنی ڈالی ہے اس ضمن میں انھوں نے زمخشری اور ان کی تفسیر "الکشاف عن حقائق التنزیل" کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



زمخشری لغت کے بہت بڑے امام تھے۔ نیز وہ ایک مانتے ہوئے معتزلی تھے۔ ان خصوصیات نے ان کی تفسیر کو ایک خصوصی حیثیت دی ہے۔ زمخشری تفسیر میں محض لکیر پیٹنے پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ اور ان کا قول ہے کہ محض لکیر پیٹنے والا ایک مریل بکری سے بھی زیادہ مکروہ ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ عقل اور "رائے" کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "علم ایک ایسا شہر ہے جس میں داخل ہونے کے دو دروازے ہیں۔ ایک عقل اور "رائے" کا دروازہ اور دوسرا روایات کا دروازہ۔"

تفسیر بالرائے ہی کے ضمن میں علم کلام اور احکام فقہ کی بنیادوں پر بھی تفسیریں لکھی گئی ہیں۔ احکام فقہ پر مبنی تفسیر "احکام القرآن" از احمد بن علی الجصاص الحنفی پر زیر نظر کتاب میں تفصیل سے تبصرہ کیا گیا ہے۔ الجصاص نے بعض تفسیری روایات پر بڑی جرأت سے تنقید کی ہے، اور بہت سی مشہور عام باتوں کا انکار بھی کیا ہے۔ مثلاً قرآن میں حضرت سلیمان کے عہد میں شیاطین کا لوگوں کو "سحر" سکھانے کا ذکر آیا ہے (ولکن الشیٰطین کفروا - یعلمون الناس السحر)۔ الجصاص نے یہاں "سحر" کے معنی فریب اور دھوکا دینے کے لیے ہیں۔ اور اس طرح بخاری کی ایک حدیث کو جس میں سحر کو جادو بنایا گیا ہے، تسلیم نہیں کیا۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ الجصاص واقعی ایک مفکر ہیں اور وہ کسی ایسے قول کو نہیں مانتے جو عقل اور تاریخی حقائق کے خلاف ہو۔" الجصاص الحنفی کی طرح فقہ مالکی کے ایک عالم ابن العربی نے بھی قرآن کی فقہی تفسیر لکھی ہے۔

زیر نظر کتاب کا اصل موضوع چونکہ کلاسیکی تفسیروں کے ضمن میں قرآن مجید کی متصوفانہ تفسیروں پر تبصرہ کرنا ہے، اس لیے "صوفی تفاسیر" کے باب میں مصنف نے القشیری سے پہلے اس بارے میں جو تفسیری کوششیں ہوئیں، ان پر محاکمہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "جب تفسیر اپنی تاریخ کے نازک دور سے گزر رہی تھی اور اسے علمائے دینیات اور علمائے کلام دونوں اپنے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے تھے، تو اس وقت صوفی مفسرین آگے بڑھے اور انھوں نے تفسیر میں نئی جان ڈالی۔" تصوف کے ظہور و فروغ کا تاریخی پس منظر بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب بتاتے ہیں کہ رسول اکرم کے عہد میں بھی بعض صحابہ میں زہد و تقشف کا رجحان پایا جاتا تھا، لیکن آپؐ نے چونکہ عیسائی راہبوں کی طرح صحابہ کو دنیا ترک کر کے عزلت نشین ہو جانے سے سختی سے روک دیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



اس لیے اس عہد میں یہ رجحان ایک حد تک رہا۔ لیکن آپؐ کے بعد جب مسلمانوں میں آپس میں جنگیں شروع ہو گئیں اور وہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگے تو بعض نے ان سب جھگڑوں سے کنارہ کشی کر کے زہد و تقشف کی زندگی اختیار کر لی۔ یہی زاہدوں یعنی زہاد کا گروہ تھا، جو بعد میں صوفی کہلائے۔

اس گروہ کو اپنے اس مسلک پر اور آگے چلنے میں اس امر سے اور بھی تقویت ملی کہ اس دور میں جہاں تک متکلمین یعنی اصحاب الرائے کا تعلق تھا، وہ بے کار کی عقلی بحثوں اور بے نتیجہ قیاس آرائیوں میں الجھے رہتے تھے۔ اور ان کے برعکس اہل فقہ ظواہر اعمال کی جزئیات پر اپنا زور قلم صرف کرتے تھے۔ بقول مصنف "ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ تصوف ایک خاموش احتجاج تھا اعلیٰ طبقوں کے سیاسی تسلط، سماجی ناانصافی، مذہبی جمود اور خشک ظاہر پرستی کے خلاف۔ چنانچہ جہاں علمائے دینیات اور متکلمین لفظی دلیل آرائیوں میں منہمک تھے، وہاں صوفی ہی تھے، جنھوں نے برملا طور پر یہ کہا کہ کلامی اور دینیاتی دلیلیں روحانیت سے سرتا سر خالی ہیں اور جمال کُلی سے صرف تصوف ہی کے ذریعہ پردہ اٹھایا جا سکتا ہے۔"

بہرحال صوفیہ کو اپنے اس نعرۂ مستانہ کی سزا بھی بھگتنی پڑی۔ ہمیشہ کی طرح اس عہد میں بھی علما کے ہاتھ میں سیاسی اقتدار تھا۔ اور انھوں نے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے صوفیہ کا احتساب شروع کر دیا۔ مصنف کے قول کے مطابق مثال کے طور پر امام ابن حنبل نے محاسبی کو گوشہ نشینی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ محاسبی کی موت پر اس کے جنازے میں صرف چار آدمی تھے۔ اسی طرح ذوالنون مصری کو قید میں ڈالا گیا، اور منصور حلاج کا جو حشر ہوا وہ تو مشہور ہے ہی۔ صوفیہ نے اس کے جواب میں علما کی دنیا داری، نفاق اور ظاہر پرستی کا مذاق اڑایا۔

اس عمل اور رد عمل کا ایک اچھا نتیجہ یہ نکلا کہ آگے چل کر ایک طرف صوفیہ میں اعتدال پیدا ہو گیا اور انھوں نے طریقت کے ساتھ ساتھ شریعت کی ضرورت بلکہ برتری تسلیم کر لی۔ اور دوسری طرف علما تصوف کے بنیادی اصولوں کو ماننے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس سلسلے میں یعنی علما اور صوفیہ دوسرے الفاظ میں شریعت اور طریقت کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور دونوں کے تضادات کو دور کر کے انھیں ہم آہنگ بنانے میں امام غزالی نے جو تاریخی کردار سرانجام دیا، اس کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ہماری تاریخ میں کوئی مثال نہیں۔ اپنے وقت پر صوفیہ نے بھی علما کی طرح قرآن کی تفسیر کا ڈول ڈالا۔ وہ نہ تو آیاتِ قرآنی کے ظاہری معانی کا انکار کرتے اور نہ قرآن کی آیاتِ احکام سے جو احکام مستنبط ہوتے ہیں، ان کو قبول کرنے سے گریز کرتے۔ لیکن بہرحال وہ ان بحثوں میں سرے سے پڑتے نہ تھے۔ وہ قرآن کی اس طرح تفسیر کرتے کہ اس سے قرآنی تعلیمات کے روحانی پہلوؤں پر روشنی پڑتی۔ مثلاً قرآن میں جہاں حضرت آدم کو شیطان سے خبردار کیا گیا ہے، سہل وہاں شیطان کے علاوہ خود نفسِ آدم بھی مراد لیتے ہیں۔ اسی طرح جامی اقامتِ صلوٰۃ کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

ایک نماز تو ظاہری ہے، وہ بھی فرض ہے اور ایک نماز روح کی بھی ہوتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں قرآن کی ان متصوفانہ روحانی تفسیری کوششوں کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مصنف لکھتے ہیں کہ صوفیہ کی ان تفسیروں کو دو نوعوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تفاسیر اشاری یا رموزی اور دوسری تفاسیر نظری۔ شیخ اکبر ابن عربی اور الکاشانی کی تفسیریں نظری تفسیروں کی بہترین مثال ہیں۔ اور جہاں تک اشاری یا رموزی تفاسیر کا تعلق ہے، اکثر علما انھیں مستند تفاسیر کا درجہ نہیں دیتے۔

یہاں ڈاکٹر صاحب نے ایک بڑی دلچسپ بحث اٹھائی ہے۔ ہمارے صوفی مفسروں نے بعد میں اپنی تفسیروں میں بہت سے ایسے افکار بھی شامل کر لیے، جو فرقۂ باطنیہ سے ملتے ہیں۔ اس صورت میں انحراف میں اور باطنی اہلِ قلم میں کیا فرق رہا۔ اس بارے میں موصوف نے شرح العقائد از عطار اللہ کا جو اقتباس دیا ہے، وہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

"یہ واضح رہے کہ صوفیا کلام اللہ اور احادیثِ نبوی کی جو عجیب و غریب تعبیریں کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ قرآن اور احادیث کے وہ معانی نہیں جو بظاہر ان کے الفاظ سے نکلتے ہیں۔ بے شک آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کے ظاہری معانی وہی ہوتے ہیں جو ان سے لغوی طور پر اور سیاق و سباق سے نکلتے ہیں۔ لیکن آیات و احادیث کے اس کے علاوہ باطنی معانی بھی ہوتے ہیں، جنھیں ایک صوفی جس کا اللہ سے تعلق ہوتا ہے، سمجھتا ہے۔ ایک حدیث ہے کہ ہر آیت کے ایک ظاہری معنی ہیں، اور ایک باطنی۔ تم اس آدمی کی دلیل آرائی سے بچو جو تمھیں یہ کہہ کر باطنی معنی معلوم کرنے سے روکتا ہے کہ اس سے قرآن اور احادیث کے مفہوم اصلی سے انحراف ہوتا ہے۔ دراصل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



مفہوم اصلی سے انحراف تو اس وقت ہوتا، اگر صوفیہ کہتے کہ آیات اور احادیث کے صرف یہی معانی ہیں۔ اس کے برعکس وہ ان کے ظاہری معانی تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ اس پر مستزاد وہ ان کے وہ معانی بھی لیتے ہیں، جو اللہ کی طرف سے ان پر القا ہوتے ہیں۔"

غرض صوفیہ آیات و احادیث سے اپنے مخصوص مطالب اخذ کرنے کے ساتھ ان کے لغوی معانی اور ان سے جو احکام و فرائض مترتب ہوتے ہیں، ان کا انکار نہیں کرتے، اس لیے فطری طور پر علما کو صوفیہ کی اس قسم کی تفسیر کے قبول کرنے میں تامل نہیں ہوتا۔

اس تمہید کے بعد مصنف چند صوفی مفسروں کی مثالیں دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سہل تستری (متوفی ۲۸۳ھ) شاید پہلے صوفی ہیں، جن کے آیات قرآنی کی تشریح کے بارے میں اقوال ان کے ایک مرید نے جمع کیے۔ ان کی تفسیر آیات کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ قرآن میں جہاں یہ ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ کے بعد ان کی قوم نے اپنے زیوروں سے ایک عجل (بچھڑا) بنا لیا، اس "عجل" کی تشریح وہ یہ کرتے ہیں:

"ہر وہ چیز جو ایک آدمی کو اس کے خدا سے دور رکھتی ہے، وہ اس کے لیے سونے کا عجل یعنی بچھڑا ہے۔ یہ اس کا خاندان، اس کے بال بچے اور اس کی ہر محبوب چیز ہو سکتی ہے۔"

اسی نوع کی ایک اور تفسیر "حقائق التفسیر" یا "تفسیر سُلمی" ہے۔ ابو عبدالرحمٰن سُلمی، ایک مانے ہوئے صوفی تھے۔ وہ آیت "ان اقتلوا انفسکم" کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ قتل نفس کے معنی اپنی نفسانی خواہشات کو ترک کرنے کے ہیں۔ ایک آیت ہے "اخرجوا من دیارکم" اس کا مطلب ان کے نزدیک دلوں کو دنیاوی محبت سے پاک کرنا ہے۔ اپنی تفسیر میں سُلمی نے منصور حلاج کے بہت سے اقوال نقل کیے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں نمونے کے طور پر ان میں سے بعض اقوال درج کیے گئے ہیں۔

کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے صوفیہ کی اشاری یا رموزی تفاسیر کی تائید میں امام غزالی کی رائے نقل کی ہے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ ایک آیت کا اشاری یا رموزی مفہوم جو ایک صوفی کے دل پر وارد ہوتا ہے، اسے مسترد نہیں کرنا چاہیے۔ اس بارے میں ایک مثالی موقف تو یہ ہے کہ ایک آیت کے ظاہری و باطنی معنی میں توازن رکھا جائے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ یہ صوفیہ کی خوش قسمتی تھی کہ امام غزالی ان کی صفوں میں شامل ہو گئے اور انھوں نے اشاری یا رموزی تفسیر القرآن کے موضوع پر ایک بلند پایہ کتاب لکھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



صوفی مفسروں کے ذیل میں ابن عربی کا نام بھی بڑا نمایاں ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے قرآن کی ایک متصوفانہ تفسیر لکھی تھی، جو نہیں ملتی۔ اب ان کی متصوفانہ تفسیر کے لیے ان کی دو کتابوں "فتوحات مکیہ" اور "فصوص الحکم" کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ زیر نظر کتاب میں ابن عربی کی ان تفسیری کوششوں پر تفصیلی بحث ہے۔ اور انھوں نے اپنے فلسفیانہ خیالات بالخصوص اپنے مسلکِ وحدت الوجود کی تائید کے لیے آیاتِ قرآنی سے جو عجیب و غریب معانی اخذ کیے ہیں، ان کا بیان ہے۔

بڑے سائز کے ان پچاس صفحوں کی کتاب میں جو ڈاکٹر رشید احمد کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ (تھیسس) ہے، التفسیری تکنیک کے تفسیر کے کلاسیکی دور کی جملہ معلومات اور ان کے متعلق صاحب مقالہ کا اپنا نقطۂ نظر آگیا ہے۔ ڈاکٹریٹ کے مقالات میں جو اجمال ہوتا ہے، وہ اس میں موجود ہے۔ اس لیے ایک عام قاری اسے پڑھ کر تشنہ رہتا ہے۔ اور موضوع زیر بحث کی پوری کیفیت اس پر نہیں کھلتی۔ ضرورت اس کی ہے کہ موصوف اس موضوع کو اور پھیلا کر لکھیں تاکہ اسے ایک کتاب کی شکل دی جا سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی تصوف کی اساس اسلام کی وہ تعلیمات ہیں، جن میں ایک طرف اخلاق پر زور ہے اور دوسری طرف عرفانِ الٰہی کو مذہب کی اصل روح بتایا گیا ہے، لیکن جب اسلامی تصوف بطور ایک علم کے مدون ہوا، تو قدرتی طور پر اس میں وہ سب افکار و خیالات داخل ہو گئے جو اُس ماحول میں عام تھے، جہاں اس تصوف کو نشوونما ملی۔ چنانچہ جب صوفیہ نے قرآن کی تفسیریں لکھیں تو دوسری قوموں کے تصوف کے افکار بھی ان میں آگئے۔ یہ براہِ راست آئے، یا اخوان الصفا اور اس جیسے دوسرے باطنیہ کے علمی اداروں کے ذریعہ آئے، یہ سوال الگ ہے لیکن ان کا ماخذ وہی تھا۔ اگر اس مقالے میں دوسرے مذاہب کے اس دور کے صوفیانہ خیالات اور بالخصوص باطنیہ کے اس ضمن میں اہمات مسائل پر ایک اجمالی تبصرہ ہو جاتا تو پیشِ نظر کتاب کی افادیت اور بھی بڑھ جاتی۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایک عرصے سے تصوف کے علمی و فکری و تاریخی پہلوؤں سے بے توجہی برتی جاتی ہے۔ اور خاص طور سے متصوفانہ تفسیر پر تو شاید ہی کسی نے لکھا ہے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



یوں بھی عہدِ جدید میں ہماری علمی و فکری زندگی پر "صوفی" کے مقابلے میں "مولوی" کو غلبہ حاصل رہا ہے۔ اور "باطن" کو نظر انداز اور "ظاہر" کو سب کچھ سمجھا جاتا ہے۔ کاش ہم آج امام غزالی کے اس قول کو اپنا مطمحِ نظر بنائیں جس میں انھوں نے ظاہر و باطن میں توازن رکھنے کی تلقین فرمائی ہے۔

ہم ڈاکٹر صاحب سے کہیں گے کہ آج دین کے ان "باطنی" پہلوؤں کو آگے لانے کی سخت ضرورت ہے۔ وہ اس کام کو جو ظاہر ہے کہ ادھورا ہے، برابر جاری رکھیں۔ وہ اس کام کو بطریقِ احسن کر سکتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کی ابتدائی تعلیم خالص دینی ہوئی۔ پھر انھیں قاہرہ میں کافی عرصہ رہنے اور وہاں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اور مزید خوش قسمتی یہ کہ کیمبرج یونیورسٹی میں انھوں نے مشرقی علوم کے مشہور پروفیسر اور تصوفِ اسلامی پر کامل عبور اور اس سے دلی محبت و خلوص رکھنے والے ڈاکٹر آربری کے تحت القشیری پر اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ مکمل کیا، جس کے دونوں حصوں پر "المعارف" میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک تصوف پر کام کرنے کی ان میں پوری علمی استعداد ہے۔ اور وہ اس پر کافی کام کر بھی چکے ہیں۔ اسی لاہور شہر میں آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے تصوف کی بعض بڑی اہم کتابوں کے اردو ترجمے ہوئے اور انھیں کافی اہتمام سے شائع کیا گیا۔ اور اس زمانے میں اہلِ علم میں تصوف کا ذوق بھی تھا، لیکن بعد میں معلوم نہیں کیوں تصوف سے اتنی بے توجہی پیدا ہو گئی۔

بہرحال ضرورت ہے کہ اب یہ بے توجہی ختم ہو، اور اسلام کی عالمگیر، انسانیت پرور، بہیت سمانی اور اخلاقی و روحانی تعلیمات کو، جنھیں ان دنوں سیاسیات اور بالخصوص حزبی سیاست کا جامہ اوڑھا دیا گیا ہے، تصوفِ اسلامی کے ذریعہ ایک نئی زندگی دی جائے۔

(س)

© rasailojaraid.com